© rasailojaraid.com

فکر و نظر............ اسلام آباد		جلد: ۴۶	شمارہ: ۱،۲

یادوں سے خانۂ دل تک-اُستاذِ محترم ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی

داؤد عثمانی

سچ تو یہ ہے کہ میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں استاذِ مکرم معظم ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی صاحب کے ساتھ وابستہ اپنی یادوں کو قلمبند کروں کیوں کہ میں انہیں مرحوم و مغفور لکھنے سے قاصر ہوں۔ اُن کی محبت و شفقت اور عنایتوں کے طفیل ان کے پاس آنے والے آج بھی مجھے عزیز رکھتے ہیں اور وہ بزرگ ہستیاں بھی جن کے پاس وہ مجھے بھیجا کرتے تھے وہ بھی شفقت سے پیش آتی ہیں اور جو مجھے نہیں جانتے تھے، اُن کو بتانے کے لیے اپنی ایک کتاب کا انتساب تک میرے نام کر دیا۔ اُن کی محبت کا بویا ہوا بیج آج ایک سایہ دار شجر کی صورت میں مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ آپ کو مرحوم و مغفور لکھنے سے قلم کانپ اٹھتا ہے۔ لرز جاتا ہے۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اب آپ صرف ہماری یادوں میں ہیں اور ساتھ ہی ان عقیدت مندوں کا خیال آتا ہے جنھوں نے استاذِ محترم سے کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں کی۔ ان سے ملنے کی خواہش ان کے دل ہی میں رہی اور اب یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکے گی اور وہ تاحیات اس کسک میں مبتلا رہیں گے۔ ان کی کیا حالت ہوگی۔ وہ بھی تو اللہ کی رضا میں راضی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ، میں کتنا خوش نصیب ہوں جسے استاذِ محترم کا اتنا قرب نصیب ہوا اور اہل خانہ کے صبر کو دیکھتا ہوں تو حکمِ ربی پر ان کے اس کامل یقین پر رشک آتا ہے کہ..... ''ہر جان کو موت ضرور آئے گی۔ موت سے چھٹکارا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر شخص کو مرنا ضرور ہے''۔ سوچا تو قلم رُک رُک کر چلنے لگا۔ بکھرے خیالات سمٹنے لگے اور پچھلے دنوں کی یادیں فوراً ذہن پر چھا گئیں اور آپ کے ساتھ گذارے آخری دن یاد آنے لگے۔

استاذِ محترم اور امی (بیگم کشفی) برسوں سے ہر سال عمرے کی ادائیگی کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس بار پہلی مئی ۲۰۰۸ء کو روانگی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے..... جانے سے پہلے کچھ املا کرانا ہے تم آ جانا..... میں نے کہا۔ سر کل آ جاؤں؟ تو کہنے لگے ہاں ٹھیک ہے۔ میں پہنچا تو انھوں نے نفیس فریدی کی شاعری پر اپنے خیالات املا کرائے۔ دوسرے دن حضرت میر سیّد علی غمگین دہلوی کے دیوانِ رباعیات ''مکاشفات الاسرار'' پر اپنے مختصر تاثرات املا کراتے ہوئے فرمایا: انہیں حضرت نسیم جی کو جا کر دے آنا۔ پھر ایک دن مشتاق احمد قریشی صاحب الوداعی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپ ان سے باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ مشتاق صاحب کی کتاب کا مسودہ فائل میں رکھا ہوگا لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آؤ...... میں نے مسودہ لا کر استاد صاحب کے حوالے کیا تو مجھ سے کہنے لگے۔ کاغذ نکالو اور لکھو انہوں نے اس کتاب پر اپنے تاثرات قلمبند کرائے اور مشتاق صاحب کے حوالے کر دیے۔ ۳۰/اپریل .... کو استادِ محترم سے بات ہوئی تو کہنے لگے۔ ہم کل نہیں جا رہے (عمرے کے لیے) عزیز الرحمٰن کو ویزا نہیں ملا۔ میں نے کہا۔ سر، پھر نئی تاریخ کب کی ہے تو کہا۔ ابھی کچھ پتہ نہیں طے ہو گی تو بتاؤں گا۔ دو تین دن بعد ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے: کسی دن آ جاؤ تو نعت پر پی ایچ ڈی کا جو مقالہ آیا ہے اس کی رپورٹ لکھوا دوں۔ چاہتا ہوں جانے سے پہلے کمپوز کرا کے بھیج دیں۔ ۷/مئی کی شام جب میں استادِ محترم کے پاس پہنچا تو وہ صبیح رحمانی کو نعت کے حوالے سے کچھ لکھوا رہے تھے۔ میں سلام کر کے برابر میں بیٹھ گیا۔ جب لکھوا چکے تو مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ صبیح نے اجازت مانگی تو ان سے کہنے لگے۔ داؤد کو ساتھ لے جاؤ، انہیں چھوڑ دینا اور مجھ سے کہا تھک گیا ہوں، کل رپورٹ لکھیں گے۔ دوسرے دن شام جب میں استادِ محترم کے پاس پہنچا۔ تو آپ نے مسہری پر بیٹھ کر رپورٹ لکھوانی شروع کی۔ ابھی وہ اختتامی مراحل میں تھی کہ لائٹ چلی گئی تو انہوں نے کہا۔ چھوڑو باقی کل لکھیں گے۔ ابھی گھر جاؤ بہت دیر بھی ہو گئی ہے۔ پھر جمعہ اور ہفتہ کے روز ہمارے علاقے (لیاری) میں کشیدگی رہی، اس وجہ سے سر کے پاس نہیں جا سکا۔ اتوار کے دن صبح فون کیا تو امی نے بتایا تمہارے استاد کی طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں۔ میں فوراً گھر پہنچا۔ دیکھا کہ آپ آنکھیں بند کیے بستر پر خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ امی نے کہا: داؤد آئے ہیں۔ میں نے سلام کیا اور سرہانے دائیں طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور کتابوں کے ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس کتاب پر مٹی لگی ہو اٹھاؤ۔ میں نے کتاب اٹھا کر آگے بڑھائی تو آپ نے اس پر تیمّم کیا اور لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھی۔ پھر امی نے آ کر پوچھا۔ بچے پریشان ہو رہے ہیں۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا بہتر ہے۔ پھر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں گھر چلا آیا۔ رات آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تو پتہ چلا کہ آپ کو نیشنل میڈیکل سینٹر کے کمرہ نمبر ۲۱۲ میں داخل کر دیا گیا۔ دوسرے دن ملنے ہسپتال پہنچا تو اس وقت رات کے قریباً نو بج رہے تھے اور آپ کو کمرے سے آئی سی یو میں شفٹ کیا جا رہا تھا۔ لفٹ کے دروازے پر میں نے آپ سے زندگی کا آخری مصافحہ کیا۔ دوسرے دن صبح ۱۲/مئی کو آئی سی یو میں خاموش ملاقات ہوئی۔ باہر آیا تو امی نے پوچھا۔ تم سے بات کی۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ پر امی! سر کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ تو کہنے لگیں۔ اپنی تسبیحات مکمل کر رہے ہوں گے۔ ۱۴/مئی بروز بدھ کی صبح قصہ ڈاکٹروں کے بس سے باہر ہو گیا اور آپ کو وینٹیلیٹر پر منتقل کر دیا۔ اگلے دن صبح سوا گیارہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بجے وینٹ سے ہٹا دیا گیا اور تین بجے کمرہ نمبر دو سو ستائیس میں منتقل کر دیا۔ جہاں آپ کے فرزند بھائی سید ابو احمد عاکف نے کلامِ الٰہی کی صداؤں میں سفر آخرت پر روانہ کیا۔ اس وقت ان کی آواز میں حسن بھی تھا اور آنکھوں میں نمی بھی۔ اہل خانہ اور عزیز و اقارب جنھوں نے چند روز پہلے آپ کی عمرے پر روانگی پر دعاؤں کی درخواست کی تھی وہ خاموش اپنے آنسوؤں میں الوداع کر رہے تھے اور امی نے اسی کمرے میں نماز پڑھ کر اپنے مجازی خدا کو حقیقی خدا کے حضور روانہ کیا۔ کمرے کی گھڑی نے سوا تین بجائے اور آپ کی روح اس عالم سے عالمِ ارواح کے لیے پرواز کر گئی۔

آدمی کا جسم کیا ہے جس پہ شیدا ہے جہاں
ایک مٹی کی عمارت ایک مٹی کا مکاں
خون کا گارا بنایا اینٹ جس میں ہڈیاں
چند سانسوں پر کھڑا ہے یہ خیالی آسماں
موت کی پر زور آندھی آ کے جو ٹکرائے گی
یہ عمارت ٹوٹ کر خاک میں مل جائے گی

ہسپتال سے آپ کے جسد خاکی کو آپ کی بڑی صاحبزادی کے گھر لے جایا گیا جہاں عصر کے وقت آپ کے چھوٹے داماد عمار بھائی نے غسل دیا۔ وہاں سے آپ کو اپنی رہائش گاہ پر لے آئے۔ جہاں سے بعد نماز مغرب آپ کی آخری آرام گاہ کے لیے جامعہ کراچی روانگی ہوئی۔ وہاں مسجد ابراہیم میں بعد نماز عشاء نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جہاں ۲۳ر اپریل ۱۹۶۳ء سے آپ کے دو صاحبزادے اور شریکِ حیات ابدی نیند سو رہے تھے۔ آپ کے سیدھے ہاتھ پر ننھے اُسامہ کی قبر ہے جس پر آپ نے کبھی لکھوایا تھا: ''سو گئے تم میرے دامن کی ہوا سے پہلے'' اور آپ کے اُلٹے ہاتھ پر تین سالہ ابوالقاسم عزام کی ننھی قبر ہے جس کے کتبہ پر یہ شعر درج ہے:

صد حیف وہ گل ہے کفِ گل چیں میں جو اب تک
آزردہ آویزشِ شبنم نہ ہوا تھا

اُن کے برابر میں آپ کی شریکِ حیات طاہرہ کشفی ہیں جن کے لوح قبر پر یہ شعر لکھا ہے:

چمکوں گی بامِ شوق پہ خورشید کی طرح
اے شامِ زندگی مرے انجام پر نہ جا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۵رمئی بروز جمعرات استادِ محترم کا دوسرا گھر بھی مکمل ہو گیا جو برسوں سے ادھورا تھا:

یادوں کے سلسلوں میں ترے لطف کا خیال
سورج کی آبشار میں جیسے کرن پڑے

حدیث نبویؐ ہے کہ ''مومن ہو ہی نہیں سکتا کوئی تم سے جب تک وہ پسند نہ کرے اپنے بھائی کے لیے وہی چیز جو پسند کرتا ہو خود اپنے لیے''۔ احباب جانتے ہیں کہ استادِ محترم اس حدیث کی شرح تھے۔ ایک دن لائبریری کے لیے کتابیں نکال رہے تھے۔ ایک کتاب تھی جس کے دو نسخے تھے۔ ایک کی جلد اکھڑ گئی تھی اور دوسرا صاف نسخہ تھا۔ جسے آپ نے میرے حوالے کیا اور کہا۔ یہ صحیح ہے، اسے لائبریری پہنچا دینا اور اس جلد سے نکلے ہوئے نسخے کے لیے فرمایا۔ اِسے کتابوں کے ریک میں لگا دو۔

پچھلے دو ایک سال کی بات ہے کہ میں ان کے گھر پہنچا، دیکھا کہ صوفہ پر آپ کے برابر میں کرتے کے دو ڈبے رکھے تھے، انہیں کھول کر مجھے دکھایا۔ اُن دونوں میں ایک زیادہ اچھا تھا۔ آپ نے اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اسے تم رکھ لو۔ میں نے کہا سر۔ یہ آپ پر زیادہ اچھا لگے گا تو کہنے لگے۔ اس لیے تمہیں دے رہا ہوں۔

محترم ملک نواز اعوان ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ مشفق خواجہ کہہ رہے تھے۔ کشفی صاحب کا جتنا علم ہے، انہوں نے اتنا لکھا نہیں۔ (۴۸ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور سینکڑوں مضامین جو آج بھی رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں، اس کے علاوہ)۔

آپ نے جب بھی کسی موضوع یا کتاب پر مجھ سے املا کرایا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے آپ کے خیالات کمپوز کیے ہوئے سامنے رکھے ہوں اور آپ پڑھ کر مجھ سے لکھوا رہے ہوں۔ مجھے یاد ہے ایک دن آپ نے ایک ہی نشست میں بچوں کے لیے نصاب کی کتاب تقریباً مکمل کرائی تھی جس میں مشقیں بھی تھیں اور نقشے بھی۔ اس طرح لکھوانے کے بارے میں میں نے ایک بار استادِ محترم سے پوچھا۔ سر! لکھوانے سے پہلے ذہن میں اس کا خاکہ تیار کرتے ہیں؟ تو فرمانے لگے۔ نہیں، بے شک جمیل الدین عالی صاحب کا کہنا حرف حرف سچا ہے کہ ''آپ صحیح معنوں میں عالم فاضل تھے''۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے بحیثیت اس کے امتی ہم سب محبت و عقیدت رکھتے ہیں، پر آپؐ کی ذات سے استادِ محترم کو جتنی محبت تھی اس کا ذکر میرے لیے لفظوں میں ممکن نہیں۔ استادِ محترم نے عمر بھر بہت کچھ لکھا۔ ہر صنف اور ہر موضوع پر لکھا۔ نعت پر لکھا۔ پر آخری عمر میں زیادہ تر نعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی کو اپنا موضوع بنائے رکھا۔ قریبی احباب جانتے ہوں گے کہ استادِ محترم چند سالوں سے ضعف کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے بہت کم لکھا کرتے تھے۔ بلکہ آخر میں نہ لکھنے کے برابر۔ لیکن سیرت پر اپنی آخری کتاب ''اخلاقِ محمدیؐ قرآن کے آئینے میں'' کے بارے میں فرماتے تھے۔ اسے میں خود اپنے ہاتھوں سے مکمل کروں گا اور اللہ نے آپ کے لرزتے اور کانپتے ہاتھوں سے آپ کی یہ تمنا پوری کرائی۔ آپؐ کے اسم سے آپ کی عقیدت کا وہ منظر آج بھی میری نگاہوں میں ہے۔ ایک بچی آپ سے انٹرویو لے رہی تھی۔ دورانِ گفتگو آپ نے سلیم کوثر کی نعت کا ایک شعر سنایا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ لیجئے وہ شعر آپ بھی سن لیجئے۔

میرے ہاتھوں اور ہونٹوں سے خوشبوئیں جاتی نہیں
میں نے اسمِ محمدؐ لکھا بہت اور چوما بہت

استادِ محترم کا نام میں نے پہلی بار اپنے مرحوم و مغفور استاد سیّد محمد رضی دہلوی کی زبانی سنا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، انھوں نے ایک شام مجھ سے کہا۔ داؤد! نواز صاحب آ رہے ہیں۔ آج ہم ''شامِ ہمدرد'' میں چلیں گے۔ پھر ہم تینوں استاد، شاگرد اور ان کے عزیز دوست ملک نواز اعوان (استاد کے وصال کے بعد نواز صاحب مجھ سے اس طرح پیش آتے ہیں جیسے میں اُن کے لیے مرحوم دوست کی قیمتی نشانی ہوں) جوں ہی ہم نے آواری ٹاور کے ہال میں قدم رکھا تو استاد کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جسے دیکھتے ہی انھوں نے نواز صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ارے! کشفی صاحب نے داڑھی رکھ لی ہے، بالکل بدل گئے ہیں۔ پہچانے نہیں جاتے۔ اب شخصیت سے بزرگی چھلکتی ہے۔ پھر استادِ محترم کے متعلق مرحوم استاد نے چند ایک باتیں کیں اور بس۔ یہ تھی میری پہلی دید جس میں میں نے انہیں دُور سے دیکھا اور صرف نام سے متعارف ہوا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ آخر ایسی کون سی بات تھی، ایسا کون سا خیال آ گیا تھا جو مرحوم و مغفور کو اُن سے ملاقات کرنے سے روک رہا تھا۔ ان کے قدم وہیں رکے رہے اور دُور سے دیکھتے رہے۔ جب کہ استادِ محترم کا نام جس انداز سے لیا تھا اور ان کے متعلق جو گفتگو کا انداز تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے ابھی کہیں گے کہ چلو! کشفی صاحب سے ملتے ہیں۔ پر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا...... آخر کیوں؟ شاید واقفیت عقیدت میں بدل گئی ہو اور مرحوم و مغفور استادِ واقفیت اور عقیدت کے درمیانی فاصلے کو فوراً عبور کرنے کی ہمت نہ محسوس کرتے ہوں۔

ایک عرصے بعد پھر میں نے استادِ محترم کا نام سنا، پر اس بار کسی ادبی محفل میں نہیں بلکہ انڈین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمبیسی کے سیکورٹی آفسر کی زبانی۔ ہوا یوں کہ سیّد امروہوی مجھے مرحوم و مغفور استاد سید محمد رضی کے دفتر سے میجلس ٹریول ایجنسی لے گئے جہاں انہوں نے کم و بیش بارہ پاسپورٹ مجھے دیے اور کہا۔ انہیں ویزا کے لیے انڈین ایمبیسی لے جاؤ پھر انہوں نے ایمبیسی کے سیکورٹی کاؤنٹر پر کسی چوہدری صاحب سے بات کرتے ہوئے میری آمد کی اطلاع دی۔ یہ پاسپورٹس ان احباب کے تھے جنہیں ۱۳ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو نئی دہلی میں ہونے والی ''اولین رحمۃ للعالمین کانفرنس'' میں بطور مقرر اور شاعر مدعو کیا گیا تھا۔ پاسپورٹ لے کر جوں ہی میں ایمبیسی پہنچا تو وہاں پر وہ سیکورٹی افسر جن سے سیّد امروہوی نے بات کی تھی، میرے منتظر تھے۔ میرے ہاتھوں سے پاسپورٹ لے کر مجھے اپنے ہمراہ ویزا آفیسر کے پاس لے گئے اور پاسپورٹ ویزا افسر جس کا نام غالبًا شرما تھا پیش کرتے ہوئے کہا کہ سر! یہ ان لوگوں کے ہیں جنہیں ''رحمۃ للعالمین کانفرنس'' میں مدعو کیا گیا ہے۔ چوہدری صاحب ان بارہ پاسپورٹ میں سے دو کی نشاندہی کرتے ہوئے کہنے لگے۔ سر! یہ دو پاسپورٹ کشفی صاحب اور ان کی بیگم کے ہیں۔ ان پر پولیس رپورٹنگ مستثنٰی کر دیجیے گا تاکہ انہیں وہاں جا کر کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

برسوں بعد ایک دن یوں ہی باتوں باتوں میں بات نکلی تو میں نے استادِ محترم سے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ سر! کیا چوہدری صاحب سے آپ کی واقفیت تھی؟ استادِ محترم کچھ دیر اس نام پر غور کرنے کے بعد فرمانے لگے۔ نہیں ایسے کسی شخص سے واقفیت نہیں رہی اور نہ ہی کسی سے ویزا مستثنٰی کرانے کی بات کی تھی، خدا اس کا بھلا کرے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ایک شخص بارہ پاسپورٹ میں سے صرف دو پاسپورٹس الگ کر کے اپنے افسر بالا سے عرض کر رہا ہے، اور یہ عرض اس خیال سے کہ کہیں انڈیا جا کر کشفی صاحب اور ان کی زندگی کی ہم سفر کو جو اس سفر میں ان کی شریک سفر تھیں انہیں کوئی پریشانی یا زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ آخر وہ شخص کون تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا؟ جب کہ استادِ محترم نے تو کافی دیر اس نام کے متعلق اپنی ماضی کی یادداشتوں میں جانے کی کوشش کی، پر کہیں سے کوئی سراغ نہ مل سکا اور نہ ہی واقفیت کا کوئی سرا۔ آپ نے صاف انکار کر دیا کہ ایسے کسی شخص سے کوئی واقفیت نہیں رہی۔ وہ واقف کار نہیں تھا اور نہ ہی آپ نے کسی سے examption کرانے کے متعلق کہا تھا۔ اگر اسے مہربانی ہی کرنی تھی تو ویزا افسر سے اس بارے میں کسی اور کا ذکر بھی کر سکتے تھے۔ آخر کار کشفی صاحب ہی کیوں؟ اس سوال پر غور کرنے کے بعد مجھے اس سیکورٹی افسر کا پتہ مل گیا، جسے چوہدری صاحب کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چوہدری صاحب اپنا شمار ایسے لوگوں میں کرتے تھے، جو میل ملاقات، محبت و برخاست و تعلقات سے بڑھ کر ایک جذبے کے تحت اس ہستی سے بنا کسی رسمی تعلق کے خود کو اتنا قریب محسوس کرتے ہیں جہاں انہیں اس ہستی سے ایک رشتہ قائم ہوتا دکھائی دیتا ہے، جسے ہم ''عقیدت'' کہتے ہیں۔ شاید وہ بھی استادِ محترم کے عقیدت مندوں میں سے ایک عقیدت مند تھا۔

۱۲/ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو پہلی بار میری ملاقات دہلی میں علی صدیقی (آرگنائزر رحمۃ للعالمین کانفرنس) کی رہائش گاہ پر ہوئی جہاں انہوں نے کانفرنس کے تمام شرکاء کے اعزاز میں ظہرانہ دیا تھا۔ وہیں مجھے اس ہستی سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہوا جن کے نام کی صدا میرے کانوں کے پردے پر دو بار دستک دے چکی تھی۔ میں نے استادِ محترم سے عرض کیا۔ سر! یہاں پر دستخط کیجئے۔ اس وقت آپ کے ہمراہ امی (بیگم کشفی) بھی تھیں۔ انہوں نے اس وقت مجھ سے جائے نماز طلب کی اور وہیں ایک کونے میں نماز ظہر ادا کی۔ اسی روز مرحوم و مغفور استاد سیّد محمد رضی کی بھی تفصیلی ملاقات الفی قرآن کی وساطت سے ہوئی۔ الفی قرآن ۱۰/ اکتوبر کو دہلی میں آزاد صاحب جو اس قرآن مجید کے ناشر تھے۔ مرحوم و مغفور استاد رضی کو تحفتاً پیش کیا تھا جس میں مرحوم و مغفور کی ایک بسم اللہ بھی چھپی ہوئی تھی۔ جب اس قرآن کی کانفرنس کے شرکاء کو زیارت کرائی گئی تو سب نے بڑی دلچسپی اور عقیدت سے اسے دیکھا پر جس طرح استادِ محترم دیکھ رہے تھے۔ وہ منظر اگر آزاد صاحب دیکھ لیتے تو یہ کہے بنا نہ رہتے کہ میری محنت کا پھل مجھے مل گیا۔ چھپائی، کاغذ، کلرا سکیم، کتابت، جلد اور خاص طور پر جو اس قرآن کی خصوصیت تھی کہ ہر سطر الف سے شروع ہوتی تھی کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے تعریف کیے جا رہے تھے۔ اس کے بعد مرحوم و مغفور استاد سے ان کے فن کے حوالے سے کچھ دیر گفتگو رہی۔

۱۴/ اکتوبر کو رحمۃ للعالمین کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت مولانا کوثر نیازی صاحب کے سپرد تھی جو شاید کسی وجہ سے مقرر وقت پر جلسہ گاہ سے غیرحاضر تھے۔ اجلاس کے آغاز کی گھڑیاں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں اور مولانا صاحب کی عدم موجودگی انتظامیہ کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اس مختصر سے وقت میں انتظامیہ کے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا کہ وہ پوری دنیا سے مدعو کیے گئے اہلِ علم و دانش میں سے کس کا انتخاب کرتے ہوئے اجلاس کی صدارت سونپ کر باقاعدہ کارروائی کا آغاز کرتے۔ اس نازک مرحلہ پر صدارت کے لیے جنہیں مدعو کیا گیا وہ میرے استادِ محترم ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی صاحب تھے۔ آپ کا جس طرح استقبال کیا گیا، اس سے یوں محسوس ہوا جیسے صدارت آپ ہی کے سپرد تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ جوں ہی اسٹیج پر آ کر صدارت کی نشست پر براجمان ہوئے تو میری پچھلی نشست سے بڑے ہی فخریہ لہجے میں میرے کانوں تک یہ آواز پہنچی...... بیگم! آپ ہیں کشفی صاحب۔ اس جملے سے مجھے ایسے لگا جیسے ان کی بیگم نے استادِ محترم کا نام سن رکھا تھا پر انہیں کبھی دیکھا نہ تھا اور دیکھنے کی خواہش مند تھیں اور ان کے شوہر کا لہجہ فخریہ اس لیے تھا کہ وہ استادِ محترم کو جانتے تھے۔ جس پر انہیں بڑا فخر تھا۔ جوں ہی میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک باریش شخص اپنی بیگم سے یہ جملہ ادا کر چکا تھا اور بڑی عقیدت مندی سے دونوں استادِ محترم کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کوئی روحانی تسکین مل رہی ہو۔

اسی اجلاس میں امی نے بھی سیرت کے موضوع پر اتنی عمدہ تقریر کی جسے حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے ایم ایل اے صاحب نے اپنی تقریر میں یہ کہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا کہ ......آپ کی تقریر تاریخ میں سنہرے لفظوں سے لکھنے کے لائق ہے......

۲۸ر اکتوبر کو ہم دہلی سے وطن عزیز کے لیے روانہ ہوئے، کراچی پہنچنے کے بعد ایک دن مرحوم و مغفور استاد رضی صاحب نے کہا: داؤد جمعہ کے دن صبح یہ طغرے کشفی صاحب کو گھر دے آنا۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس روز ایک استاد نے مجھے دوسرے استاد کے سپرد کر دیا۔ جس کی آنے والے وقت نے تصدیق بھی کر دی۔

جمعہ کے دن صبح ساڑھے دس یا گیارہ بجے میں ان کی رہائش گاہ جامعہ کراچی پہنچا تو آپ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے اور طغرے رکھواتے ہوئے کہا رضی صاحب سے کہنا میں نے سعید کشتی والا صاحب سے بات کر لی ہے۔ کچھ دن بعد پتہ کریں۔ چند دنوں بعد مرحوم و مغفور استاد رضی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان طغروں میں سے چند طغرے سعید صاحب نے خرید لیے ہیں۔ استادمحترم کشفی صاحب اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ صرف واہ واہ! سبحان اللہ!، ارے کیا بات ہے! سے فنکاروں کا پیٹ نہیں بھرتا ان کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔

استادِ محترم کا یہ پیغام رضی صاحب سے کہنا کہ کچھ دنوں بعد پتہ کریں، لے کر میں اُن کی رہائش گاہ اور بس اسٹاپ کے درمیان کا فاصلہ کچھ ہی طے کیا تھا کہ آپ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گاڑی رکوا دی اور فرمایا: کس طرف جاؤ گے، بیٹھ جاؤ، چھوڑ دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ شکریہ سر۔ سڑک سے گاڑی مل جائے گی۔ پر استادِ محترم نے شاید مجھ پر شفقت کا سایہ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس لیے کار کا دروازہ فوراً کھولتے ہوئے فرمایا: بیٹھ جاؤ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دھوپ بہت ہے۔ اور آپ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ (اس وقت آپ نے مجھے دھوپ سے بچانے کے لیے کار کی چھت نہیں بلکہ اپنی محبت اور شفقت کا سایہ کیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ گھنا ہوتا گیا) پھر میں آپ کے پاس آنے جانے لگا۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے۔ تم اردو میں ایم-اے کیوں نہیں کرتے، یوں کرو اُردو میں ایم-اے کر لو تا کہ آگے بڑھنے کے لیے کوئی راہ بن سکے۔ میں نے عرض کیا۔ سر! مجھے اتنی اُردو نہیں آتی جو میں اپنا نام ایم-اے کے لیے رجسٹر کراؤں۔ فرمانے لگے۔ ہمت کرو میں پڑھاؤں گا۔ اس طرح ایک عقیدت مند کو شاگرد بناتے ہوئے ایم-اے اُردو کرا دیا۔ پھر اُردو سے دلچسپی بڑھانے اور لکھنے لکھانے کا شوق پیدا کرنے کے لیے استادِ محترم نے مجھے مرزا قلیچ بیگ کی آپ بیتی جو کہ سندھی میں ہے، اسے اُردو میں ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ترجمہ کرنا کتنا مشکل اور دشوار کام ہے اس کا اندازہ مترجم حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔ میں نے استادِ محترم سے مشکل کا اظہار کیا تو فرمانے لگے۔ گھبراؤ مت بسم اللہ کرو، میں اُسے دیکھوں گا۔ آپ کے ان کلمات سے مجھے اتنی تقویت ملی کہ میں اس دشوار گزار گھاٹی کا مسافر بننے کو تیار ہو گیا اور اُردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔

استادِ محترم کسی کو مشورہ دے کر یہ نہیں سمجھتے تھے کہ فرض پورا ہو گیا جس پر عمل کر کے آج نہیں تو کل اسے ضرور فائدہ ہوگا بلکہ مشورے کی تکمیل میں اگر اسے کسی مشکلات کا سامنا ہے اور وہ آپ کی رہنمائی لینا ضروری سمجھتا ہے تو آپ اس کی رہنمائی کرنا اور اس کی مشکلات کا حل تلاش کرنا اپنے مشورے کا حصہ سمجھتے ہوئے اس کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔

استادِ محترم نے ایک دن مجھے اپنے دو مضمون نقل کرنے کو دیئے تو تھوڑی دیر کے لیے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نئے سرے سے لکھوانے کے بجائے فوٹو اسٹیٹ کرانے کو کیوں نہیں کہتے، پر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن سے یہ خیال نکل گیا کہ فوٹو اسٹیٹ کیوں نہیں کرواتے، نقل کیوں کراتے ہیں۔ میں تو بس اس خیال ہی سے اترائے جا رہا تھا اور بڑا خوش تھا کہ آج پہلی بار آپ نے مجھے کوئی کام کرنے کو دیا ہے۔ پر اس وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کام ان کا نہیں بلکہ میری ہی تربیت کا حصہ ہے۔ جس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں استادِ محترم کی کتاب ''ہمارے عہد کا ادب اور ادیب'' کے حرفِ آغاز میں پروفیسر اویس احمد ادیب کی تحریر بعنوان ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' پڑھی۔ جس میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں: ''کشفی صاحب کا ذوق، ان کا رجحان اور اُردو سے ان کی محبت دیکھ کر میں نے انہیں ایسا کام سونپا تھا جو کسی طرح بھی خوش گوار نہیں تھا مگر انہوں نے دل و جان سے اس کام کی تکمیل کی۔ یعنی میرے مضامین کی نقلیں کیں۔ ابوالخیر صاحب نے بہت جلد میری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تنقیدوں کا انداز اختیار کر لیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ان کا انفرادی اندازِ تحریر اور ان کی قدرتی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ اس وجہ سے میں نے ان سے آزادانہ طور پر مضامین لکھنے کے لیے کہا۔ انہوں نے اس پر عمل کر کے چند دنوں میں ہی اپنا موجودہ طرزِ تحریر ظاہر کر دیا''۔

استادِ محترم نے تو اپنے استاد کا طریقہ کار میرے ساتھ دہرایا تاکہ مجھے بھی کچھ ٹھیک سے لکھنا آ جائے۔ مگر میں انفرادی اندازِ تحریر کہاں سے پیدا کر پاؤں گا کیوں کہ نہ ہی مجھ میں قدرتی صلاحیت ہے، نہ اُن جتنا ذوق و رجحان اور نہ ہی ان کے برابر اُردو سے محبت بلکہ اس کے ذرہ برابر بھی مجھے نصیب ہو جائے تو اپنے لیے باعث فخر سمجھوں گا۔ آج بھی جب کبھی وقت ملتا ہے تو استادِ محترم کے لکھے ہوئے مضامین کی نقل کرتا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن مجھے بھی لکھنا آ جائے گا۔

ایم-اے کے امتحانات ہو رہے تھے اور استادِ محترم مجھے فارسی کے پرچے کی تیاری کراتے ہوئے میرے متعلق ''من'' کے عنوان سے چند جملے تحریر فرمائے جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ آپ نے لکھا:

من

من یک جوانِ پاکستانی ام

شوق دارم کہ تحصیل علم کنم

بدیں وجہ مطالعۂ ادبیات کنم

انشاء اللہ بعد کامیابی در ایم-اے در تاریخ اُردو تحقیق خواہم کرد

ارادہ دارم کہ تاریخ صحافتِ اردو در سندھ بنویسم

امتحانات ہو گئے۔ میں ایم-اے اُردو ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہن سے یہ جملے بھی نکل گئے۔ ایک عرصے بعد میں نے سر سے کہا...... سر! میری خواہش ہے کہ پی ایچ ڈی کروں۔ تو فرمانے لگے۔ پہلے تو کبھی اس خواہش کا ذکر نہیں کیا، اور ابھی تم نے اتنا پڑھا بھی نہیں۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔ اچھا سوچیں گے۔ اس بات کو چند ماہ گزر گئے۔ ایک دن آپ نے فرمایا۔ ایک موضوع ذہن میں آیا ہے: ''قیامِ پاکستان سے پہلے سندھ میں اُردو صحافت کا تنقیدی جائزہ'' یہ وہی موضوع تھا جو آپ نے غیرارادی طور پر عرصہ پہلے میرے حوالے سے تحریر فرمایا تھا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''ارادہ دارم کہ تاریخ صحافتِ اردو در سندھ بنویسم'' استادِ محترم کا یہ غیرارادی جملہ میرے لیے ارادہ بن کر سامنے آ گیا اور میں نے مواد کی تلاش شروع کر دی۔ مہینوں گزر گئے پر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد دو موضوع اور استادِ محترم کے زیرِ غور آئے۔ پر ایک دن آپ نے فرمایا۔ اب موضوع مل گیا۔ ''علامہ راشد الخیری اور ان کے خاندان کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ'' مواد بھی مل جائے گا۔ خاکہ تیار کرو۔ مواد جمع کرتے ہوئے خاکہ تیار کیا اور آپ کی نگرانی میں اپنا نام پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹرڈ کرا دیا۔ جبکہ اکیس برس پہلے آپ نے اس موضوع کے ایک اہم باب صادق الخیری پر ایم-اے کے کسی طالب علم سے مقالہ لکھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جس کی نشاندہی فروری ۱۹۸۱ء کے اس خط سے ہوتی ہے جو آپ نے صادق الخیری کے نام لکھا تھا، جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ''......اور اس سال کسی طالب علم سے آپ پر ایم-اے کا مقالہ لکھواؤں گا''۔ وقت کے ساتھ موضوع بھی پھیلتا گیا۔ یہاں تک کے اس نے پورے خاندان کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔

قدرت کا کرشمہ دیکھئے اس نے کس طرح آپ کی کہی دو باتیں ایک ''غیرارادی'' اور دوسری ''ارادی'' کس طرح ایک ارادہ بنا کر مجھ ناچیز کے ذمہ کر دیا۔ اے اللہ! مجھے اتنی ہمت اور صلاحیت دے کہ میں اپنے استادِ محترم کے اس ارادے کو پورا کر سکوں اور جو عزت مجھے ان کے نام سے ملی ہے اس کی لاج رکھ سکوں۔

استادِ محترم شاہ سیّد فتح محمد کڑوی کی اولاد سے تھے۔ شاہ فتح محمد اپنے وقت کے اولیاء کاملین میں تھے۔ آپ کی وفات ۱۱۱۴ھ بمقام کڑا میں ہوئی۔ آپ کے صاحبزادے شاہ فقیراللہ اور شاہ بدر الدین اتباع سنت میں ممتاز اور بدعت سے مجتنب رہے۔ ان کی نسل سے شاہ محمد ابراہیم نہایت عابد و زاہد بزرگ اور اپنے وقت کے بابرکت شخصیتوں میں سے تھے۔ آپ ایک عرصہ تک اطراف و جوانب کو منور کرتے رہے۔ آپ کا شاہ پیر علی سلونی رائے بریلی سے بیعت کا تعلق تھا۔ اس سلسلے کی آخری دور کی شخصیتوں میں سیّد محمد افضل بن محمد تقی حضرت شیخ الھند، مولانا محمود الحسن کے معاصر اور ہم سبق تھے اور حضرت شیخ رشید احمد گنگوہی کے عزیز ترین شاگرد اور مرید تھے۔ شرک و بدعت اور قبر پرستی کے خلاف جہاد کی طرح اپنے جذبات کے ساتھ کام جاری رکھا اور علمی جہاد کی تمنا لیے ہوئے وفات پائی۔ اسی طرح آپ کے بھائی شاہ محمد اکبر جو استادِ محترم کے دادا تھے، دینی کاموں کے ساتھ چالیس سال تک اپنے دور کے بڑے مصلح اور روحانی پیشوا شاہ غلام رسول رسول نما جو استادِ محترم کے والد کے پرنانا تھے ان کی خانقاہ میں رہے اور ایک عرصہ مخلوق کی خدمت کرتے رہے۔ شاہ محمد اکبر کے صاحبزادے سیّد ابوطاہر نے مدرسہ الٰہیات اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں تعلیم حاصل کی خانقاہ ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ساری عمر گزاری۔ خاموش طبیعت اور صاحب وجیہ شخص تھے۔ بزرگوں کے معمولات کے پابند شرک و بدعت سے دور اور خانقاہ کی مسجد کی امامت کرتے، اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

استادِ محترم کے نانا سیّد علی اوسط رشک فتح پور کے اہم شعراء میں سے تھے اور بڑے ماموں سیّد محمد بھی شاعر تھے۔ بڑے چچا سیّد محمد ہاشم جامعہ عثمانیہ میں دینیات کے پروفیسر تھے اور رسوا تخلص اختیار کرتے ہوئے شاعری بھی کیا کرتے تھے۔

استادِ محترم کے والد شاہ سیّد ابو محمد ثاقب کانپوری شاہ محمد اکبر کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ ۱۹۰۴ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ آپ شعر گوئی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ''متاعِ درد'' اور ''روحِ جاوداں'' کے نام سے آپ کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔ آپ کے اس شعر:

جان دیتا ہوں قفس میں دونوں پر کھولے ہوئے
حسرت پرواز میں بھی شان ہے پرواز کی

پر شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے لکھا ''ثاقب صاحب آپ کے اس شعر نے میری روح کو تڑپا دیا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے''۔

''شہرِ ادب کانپور'' میں ڈاکٹر سیّد سعید احمد لکھتے ہیں: ''اُردو شاعری کی کوئی تاریخ ثاقب کے تذکرے کے بغیر نامکمل کہلائے گی''۔

ان دو شعری مجموعوں کے علاوہ ''انتخاب سودا'' اور ''آریہ سماج کا آئینہ'' آپ کی تصنیفی اور تالیفی یادگاریں ہیں۔ اس کے علاوہ معروف ادبی رسائل میں تراجم، تنقید و تحقیق، ادبی مضامین اور افسانے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ادبی صحافت میں قدم رکھتے ہوئے ''نظارہ'' نامی ایک ادبی ماہنامہ بھی جاری کیا جو تقریباً دو سال تک جاری رہا۔

استادِ محترم کے چھوٹے بھائی ابوالحسنات حقی جدید شاعری میں ایک معتبر نام ہے۔ آپ کی ہمشیرہ حمیرہ خاتون بھی صاحبِ قلم تھیں۔ ان کی نگارشات ماہنامہ ''ھمت'' کی زینت رہیں۔ استادِ محترم کی والدہ ایک راسخ العقیدہ خاتون تھیں۔ جنہیں آپ باجی کہا کرتے تھے۔ ان کے متعلق آپ فرماتے ہیں: ''باجی ایک وسیع المطالعہ خاتون تھیں۔ ان کے زیر مطالعہ مذہبی کتابیں ہوتیں اور ادبی بھی۔ اپنے دور کی عام خواتین کے مقابلے میں ان کا فہم دین بہت اعلیٰ تھا''۔

استادِ محترم کا پہلا عقد ۱۹۵۷ء میں طاہرہ احمد سے ہوا جو سات سال کی رفاقت کے بعد اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تین بیٹوں میں سے سیّد ابو محمد عاکف کو چھوڑ کر تین سالہ ابو القاسم عزام اور ننھے اسامہ کے ساتھ ایک ٹریفک کے حادثہ میں ۲۳ اپریل ۱۹۶۳ء کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔ آپ ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ ان کے افسانے ''ساقی'' اور ''اُردو سائیکولوجی'' میں شائع ہوتے تھے۔ آئینہ تکرار تمنا'' ، ''موت کی وادیوں میں اک آواز'' اور ''ایک البم ایک تصویر'' ان کے اچھے افسانے ہیں۔

۷ ستمبر ۱۹۶۶ء کو بلقیس شاہین سے استادِ محترم کا عقد ثانی ہوا۔ وہ بھی صاحب قلم ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر میں افسانے، خاکے، مضامین اور مقدمات تحریر کیے۔ آپ کی دو تالیفی کاوشیں ''کشفی صاحب آپ کے لیے'' اور ''کشفی صاحب مزید آپ کے لیے'' بہترین شاہکار ہیں۔ جن کے متعلق انور سدید لکھتے ہیں کہ ''گزشتہ برس ایک دلچسپ روایت کا آغاز کراچی سے محترمہ بلقیس شاہین نے کیا اور اس میں عقیدت کے وہ زاویے شامل کر دیے جو برسوں کے حسن و سلوک، خلوص اور احسان مندی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر کراچی کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں ضرور ہوا ہوگا''۔ اور ایک شعیب ابرو فیض آبادی کی کتاب ''نظر نظر طیبہ'' کی ترتیب شائع ہو چکی ہے۔

استادِ محترم کے صاحبزادے سیّد ابو احمد عاکف بھی صاحب کتاب ہیں۔ ان کے نام سے انگریزی میں دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک Reflection of Japan in Pakistani Eyes اور دوسری استادِ محترم کے سفر نامے ''وطن سے وطن تک'' کا انگریزی ترجمہ From Home to Home Land کے نام سے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' اور ''ٹوٹ بٹوٹ'' میں بھی لکھا کرتے تھے۔ اور ان کی صاحبزادی عائشہ کی تحریریں بھی روزنامہ ''ڈان'' میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اُستادِ محترم کا سن ولادت دستاویز کے مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء ہے۔ مگر آپ کا اپنا بیان ہے کہ میرا سن پیدائش ۱۹۳۰ء یا اس سے کچھ پہلے کا ہے۔ آپ کانپور کے علاقے بیگم گنج میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ والدہ آپ کی پہلی معلّمہ تھیں۔ فارسی مولانا سعید رزمی سے پڑھی۔ ان کے متعلق آپ فرماتے تھے: ''مولانا کا پڑھانا میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ایک ہی سال میں فارسی میں اس حد تک رواں ہو گیا تھا کہ جلسوں میں فی البدیہ تقریر کر لیتا۔ ان کی مستقل شاگردی میں رہ کر ''سیرۃ النبی ﷺ'' پڑھنے کا شوق ہوا اور دینی و عمومی تعلیم کے دروازے مجھ پر وا ہونے لگے۔ میں بہ مشکل آٹھ یا نو سال کا تھا، وہ لوگ جنہوں نے مجھے اس عمر میں جلسوں میں خطاب کرتے سنا، آج بھی موجود ہیں''۔

استادِ محترم نے ہائی اسکول ۱۹۴۵ء حلیم مسلم انٹرمیڈیٹ کالج کانپور سے کیا۔ جس میں آپ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مضامین، انگلش، میتھامیٹکس، ہسٹری اور ایلیمنٹری سوکس، ماڈرن انڈین لینگوتج، اُردو، اور اختیاری مضمون میں عربی شامل تھا اور انٹر بھی اسی کالج سے کیا۔ اس کے بعد کرائسٹ چرچ کالج میں بی-اے میں داخل ہوئے امتحان دینے سے پہلے ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے۔ کراچی آ کر اپنی تعلیم از سر نو شروع کی۔ ۱۹۵۰ء میں سندھ یونیورسٹی سے بی-اے آنرز کیا۔ اور ۱۹۵۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم-اے (اُردو) ۱۹۶۷ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے لسانیات اور تدریس انگریزی میں ایم-اے کیا پھر ۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۱۷۰۷-۱۸۵۷ء'' کے موضوع پر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب کی رہنمائی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

استادِ محترم کو دوران طالب علمی ہی میں اسلامیہ کالج، کراچی میں بطور لیکچرار تدریس کا موقع ملا۔ جہاں آپ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۶ء تک رہے۔ اس کے بعد اُردو کالج کراچی میں ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۹ء تک درسی فرائض انجام دیتے رہے۔ (وقت کا پلٹنا دیکھیے استاد محترم نے ۱۹۴۰ء میں لطیف اثر اور عبدالستار سے تقریباً دو ماہ انگریزی پڑھی تھی۔ کراچی آ کر عبدالستار آپ کے شاگرد ہوئے اور آگے چل کر استادِ محترم نے اپنے استاد لطیف اثر کی کتابوں پر دیباچے لکھے) ۱۹۵۹ء میں اُردو کو چھوڑ کر جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو سے منسلک ہوئے جہاں ۱۹۵۹ء تا ۱۹۷۸ء تک لیکچرار رہے۔ اسی دوران تین سال ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء تک جامعہ اوساکا برائے زبانہائے خارجی (جاپان) کے شعبہ پاک و ہند میں مہمان پروفیسر رہے۔ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۲ء تک ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے اور ۱۸ر فروری ۱۹۹۲ء میں بطور پروفیسر جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس دوران آپ صدر شعبہ بھی رہے۔ ۱۹۹۱ء میں آپ کو جامعہ کی ٹیچرز سوسائٹی کی جانب سے نشانِ عظمت دانش ایوارڈ دیا گیا۔ پھر ۱۹۹۷ء میں ناظم سیرت اسٹڈیز سرسید انجینئرنگ یونیورسٹی رہے۔

استادِ محترم نے اڑتالیس (۴۸) کتابیں، تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ آپ کی علمی و تصنیفی کاوشوں کے صلے میں ۱۹۷۵ء میں داؤد ادبی ایوارڈ اور ۱۹۹۱ء میں آپ کی کتاب ''حیاتِ محمدی قرآن کے آئینے میں'' کو صدر پاکستان کی طرف سے قومی سیرت ایوارڈ دیا گیا۔

اس کے علاوہ ادارتی کاموں میں بھی مصروف رہے۔ کئی مؤقر علمی و ادبی رسائل کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ مثلاً مضراب، کانپور، قومی زبان کراچی، مہر نیم روز کراچی، منزل نیو یارک، اُردو معلّٰی جاپان، رفتار شعبہ اردو جامعہ کراچی، الاسلام کراچی اور مجلس مطبوعات و تحقیقات اُردو، کراچی کے ناظم کی حیثیت سے تقریباً بارہ کتابوں کی ترتیب و اشاعت کی۔ روزنامہ ''جنگ'' اور ''جسارت'' میں کالم بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکھے اور جسارت ہی کے ہفتہ وار میگزین ''فرائیڈے اسپیشل'' میں جیمز اے مچل کی کتاب کا اردو ترجمہ اینڈاوَ کاپل ے نام سے قسط وار قائع ہوا۔ اور اسی میگزین میں ان کا سفرنامہ ''لوشین کے دیس میں'' بھی قسط وار شائع ہوتا رہا۔ آپ نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے بے شمار فیچر بھی لکھے اور ایک ہزار سے زائد ٹی وی اور ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کی جن میں ریڈیو جاپان اور وائس آف امریکہ کے پروگرام بھی شامل ہیں۔ آپ تقریباً ستائیس علمی و ادبی اداروں سے منسلک رہے۔ سو سے زائد کتابوں پر مقدمے، دیباچے، پیش لفظ اور فلیپ لکھے۔ دو سو کے قریب حمد و نعت، سیرت، ادبی و تنقیدی، شخصی و تاثراتی اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھے جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

استادِ محترم نے مختلف ممالک، جاپان، امریک، برطانیہ، فرانس، اٹلی، ترکی، کینیڈا، اُردن، سعودی عربیہ، تھائی لینڈ، فلی پائن، چین اور بھارت کا سفر بھی کیا۔

شیخ الجامعہ، جامعہ کراچی پروفیسر ڈاکٹر پیر زادہ قاسم نے ۱۲/ستمبر ۲۰۰۶ء کو ''ایک شام ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب کے ساتھ'' میں اپنے استادِ محترم کے متعلق فرمایا تھا کہ ''اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنی دینی روایات کوریٹر کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل تک نہیں جاتیں اس کے لیے ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی صاحب جیسے لوگ چاہئیں''۔ اور اسی تقریب میں استادِ محترم نے ان کے لیے فرمایا۔ ''پیر زادہ قاسم جیسا شاگرد دیکھتا ہوں تو یہی گمان ہوتا ہے کہ عمر رائیگاں نہیں گئی''۔

بے شک آپ کی عمر رائیگاں نہیں گئی کیوں کہ آپ نے انہیں ادب کے ذریعے زندگی سکھائی اور اپنی تحریر و کردار کے ذریعے اپنی تہذیب، ثقافت اور دینی روایتیں لوگوں کو پہنچائی ہیں۔ علم انسان کو حقیقی روشنی سے روشناس کراتا ہے۔ جہاں اسے اندھیرے اجالے کا فرق صاف اور واضح دکھائی دیتا ہے۔ جس سے وہ اپنے من کی دنیا منور کرتا ہے۔ یہی روشنی جب عملی زندگی پر پڑتی ہے تو زندگی علم و عمل کا روح پرور سنگم دکھائی دیتی ہے۔ پھر کہیں جا کر انسانوں میں میرے استادِ محترم ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی صاحب جیسی شخصیت جنم لیتی ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆☆☆

© rasailojaraid.com